

متگنائے نعت کے آداب اور اقبال آفاقی

The Etiquette of the Constrained Domain of Naat and Iqbal Afaqi

Dr. Usman Ghani

Senior Instructor, Urdu Department, NUML, Islamabad

ughani@numl.edu.pk

KEYWORDS

Urdu Naat
Devotional Poetics
Aesthetic Restraint
Transcendence
Ethical Intentionality
Representation of the Sacred
Phenomenology
Semiotics
Modernity and Tradition
Poetic Conventions

DATES

Received 30-10-2025
Accepted 20-11-2025
Published 31-12-2025

QR CODE



ABSTRACT

Urdu Naat, when viewed through a critical and philosophical lens, emerges as a disciplined yet dynamic genre. Its true strength lies not in unbounded expression but in a consciously cultivated restraint that transforms limitation into depth. In my view, the future of naat depends on its ability to engage modern critical thought without compromising its foundational ethos of reverence—thereby preserving its unique position as both poetry and prayer. In this article Iqbal Afaqi discussed a critical issue in contemporary naat is the tension between innovation and orthodoxy. Excessive formal experimentation or metaphorical boldness can risk desacralization, while rigid adherence to tradition may lead to stagnation. The most successful modern naat negotiates this tension by reactivating classical symbols within new experiential contexts. In the modern era, naat encounters new challenges: secularization, globalization, and the diversification of literary forms. Here, phenomenology offers a useful framework. The naat poet's task is to articulate an inner experience of حضور (presence) that is both deeply personal and communally intelligible. The experience of the Prophet is not direct but mediated through love, memory, and tradition—thus rendering naat a phenomenological reconstruction of sacred presence.

<https://journals.mehkaa.com/index.php/negotiations/article/view/181>

تلخیص:

اردو نعت کو اگر تنقیدی اور فلسفیانہ زاویے سے دیکھا جائے تو یہ ایک منظم مگر متحرک صنف کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اس کی اصل قوت بے لگام اظہار میں نہیں بلکہ ایک شعوری طور پر اختیار کی گئی ضبط و احتیاط میں مضمر ہے جو حدود کو گہرائی میں بدل دیتی ہے۔ میرے نزدیک نعت کا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ وہ جدید تنقیدی فکر سے کس حد تک ہم آہنگ ہوتی ہے، بغیر اس کے کہ اپنے بنیادی جذبہ عقیدت کو مجروح کرے۔ اسی توازن کے ذریعے وہ اپنی منفرد حیثیت، بطور شاعری اور بطور دعا، کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ اس مضمون میں اقبال آفاقی نے معاصر نعت میں ایک اہم مسئلے کی نشاندہی کی ہے جو جدت اور روایت کے درمیان کشمکش کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ حد سے زیادہ فنی تجربات یا استعاراتی جرات بعض اوقات تقدیس کو متاثر کر سکتی ہے جبکہ روایت سے سختی کے ساتھ چمٹے رہنا جمود کا باعث بن سکتا ہے۔ کامیاب جدید نعت وہی ہے جو اس کشمکش کو اس طرح حل کرے کہ کلاسیکی علامات کو نئے تجرباتی تناظر میں دوبارہ زندہ کر دے۔ جدید عہد میں نعت کو کئی نئے چیلنجز کا سامنا ہے جیسے سیکولر ائزیشن، عالمگیریت اور ادبی اصناف کی تنوع پذیری۔ اس تناظر میں مظہریات ایک مفید فکری فریم فراہم کرتی ہے۔ نعت گو شاعر کا اصل کام "حضور" کے ایک ایسے باطنی تجربے کو بیان کرنا ہے جو ایک طرف نہایت شخصی ہو اور دوسری طرف اجتماعی طور پر قابل فہم بھی رہے۔ حضور نبی ﷺ کا تجربہ براہ راست نہیں ہوتا بلکہ محبت یادداشت اور روایت کے وسیلے سے تشکیل پاتا ہے۔ اس طرح نعت دراصل ایک مقدس حضور کی مظہریاتی تشکیل بن جاتی ہے۔

مضمون کے عنوان سے بلاشبہ ذہن میں غالب ہی آتا ہے اور آنا بھی چاہیے؛ مگر یہاں میری مراد کچھ اور ہے، جیسے غالب کی مراد کچھ اور تھی۔ شاعر موصوف کے ذہن میں افکار کا جوش اس قدر تھا کہ وہ روایت کے سانچے کو توڑ دینا چاہتا تھا، نہ کہ نظم کا طالب تھا۔ اسی لیے بڑے متن کی ایک ترکیب کے معنوی سیاق و تناظر میں معمولی تبدیلی کی بدولت نظم سے نثری نظم کا راستہ ہموار ہوا اور مزے کی بات ہے کہ نثری نظم والوں کے پاس بھی اسی ترکیب کا سہارا ہے؛ ہونا بھی چاہیے کہ بڑا متن اپنی مغائرت معنی میں بھی بچے جتنا رہے گا، چاہے پھر وہ مفلوج ہی کیوں نہ ہوں!!

غالب کی اسی تنگنائے غزل کی ترکیب کو اقبال آفاقی نے ”نعت ایک ایسی تنگنائے ہے جس سے گزر کر ہی نعت گو قبولیت و کامرانی کی منزل کو پاسکتا ہے۔“⁽¹⁾ ایسے استعمال کیا ہے۔ میرے نزدیک ابھی تک اس سے بہتر اس ترکیب کا استعمال نہیں گزرا اور کمال یہ ہے کہ یہ جملہ مصنف موصوف نے مضمون کے آخر میں استعمال کیا ہے جب وہ نعت کی تنگنائے کے اصول و ضوابط مقرر کر چکے تھے یعنی نعت کی پرکھ، تجزیے اور تنقید کا ایک نیا نظری دائرہ کار جسے میں نے آداب سے منسوب کیا ہے۔

نشانِ خاطر رہے کہ اقبال آفاقی کے صرف ایک مضمون ”نعت: ایک روحانی تجربہ“ پر میں مضمون لکھ رہا ہوں کیوں کہ اس مضمون میں وہ بہت کچھ ہے جو کہ ضخیم کتابوں میں بھی بعض اوقات نہیں ملتا۔ اقبال آفاقی کون ہیں اور ان کی عمر کتنی ہے؟ میری دلچسپی مذکورہ مضمون میں اسی لیے ہوئی یعنی ایک ایسا شخص جس نے ساری عمر فلسفیانہ بحثوں اور مطالعات میں گزاری ہو جس کی بنیادی و اعلیٰ تعلیم بھی فلسفے میں ہو اور وہ ستر اٹھتر سال کی عمر میں پہنچ کر نعت پہ بات کر رہا ہو تو یقیناً مجھ ایسا شخص ضرور چونکے گا اور اس مضمون کی طرف لپکے گا اور ایسا ہی ہوا۔ مگر میں نے متن کو اس کے بالکل برعکس پایا جو کہ میرے دماغ میں تھا، بقول اقبال ”ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے“۔ مضمون تو سارے ہی علم سے معمور ہیں مگر میری حیرت کو دوچند کرنے کے لیے ایک اور مضمون ”اقبال: شہرِ حکمت کا شاہزادہ“ بھی ہے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ کوئی طویل مضمون نہیں، صرف ساڑھے چھ صفحات پر مشتمل ہے۔

صاحبِ مضمون نے نعت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے نسیم اللغات سے اس کے معنی درج کیے ہیں اور بتایا ہے کہ اس میں تین لفظ قابلِ توجہ ہیں: نظم، مدح اور حضور ﷺ۔ مرکزی بحث لفظ ’مدح‘ کی ہے جو جاننا چاہیے کہ کیا ہے اور کیا نہیں۔ مدح کا عام خیال وہی ہے جو وہ کہتے ہیں کہ ہم کسی بھی شخص کی مدح کرنے میں حد درجے غلو اور چاپلوسی سے کام لیتے ہیں اور اپنی عزتِ نفس تک داؤ پر لگا دیتے ہیں تاکہ مدوح خوش ہو کر ہم پر عنایات کے دروار کھے مگر حضور ﷺ کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ اس سیاق میں ان کا ماننا ہے کہ دو شرائط اور بھی فرض ہو جاتی ہیں اور وہ ہیں: حزم و احتیاط اور احترامِ آدمیت۔ لکھتے ہیں:

”یہاں رندی و دیوانگی چلتی ہے نہ ہی مطلب براری۔ چاپلوسی اور Propitiation کا تو سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔“ (2)

لفظ Propitiation قابلِ توجہ ہے۔

حضور ﷺ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو محبت تھی اس کی وجہ مصنف نے ان کا حضور ﷺ کی بارگاہ میں قرب کا تجربہ بتایا ہے اور کہا ہے کہ یہ ایک مابعد الطبیعی ڈائنمنشن ہے جسے ولگن سٹائن (Ludwig Wittgenstein) نے Seeing-as کا نام دیا ہے۔ ابو جہل اور اس کے پیروکار حضور ﷺ کی عظمت کو اس لیے نہیں پہچان سکے کہ وہ علماتی اندھے پن (Epistemic Blindness) کا شکار تھے۔ میں نے دانستہ ان دونوں فلسفیانہ اصطلاحات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس سے اندازہ ہو سکے کہ حضور ﷺ سے محبت یا دوری انھی دو اسباب کی بدولت ممکن ہوتی ہے۔ Seeing-as فلسفے کی ایک اہم اصطلاح ہے جس سے ہم اپنی زندگی کو نہ صرف بدل سکتے ہیں بلکہ ایک نئے رخ پہ بھی ڈال سکتے ہیں۔ جو شخص چیزوں کو ویسے دیکھتا ہے جیسا کہ اس کی نگاہیں دکھاتی ہیں تو وہ اپنے دماغ میں پہلے سے موجود ڈیٹا سے کام لیتا ہے اور اصل رخ دیکھنے سے قاصر رہتا ہے اور جو شخص Seeing-as سے کام لیتا ہے یعنی جیسے ہی چیزوں کا دوسرا رخ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کو ایک نیا پہلو دکھائی دینے لگتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو وہ چیزوں کی اصلیت کو کبھی جان نہیں سکتا اور حقیقت سے نا آشنا رہتا ہے۔ دوسری اصطلاح Epistemic

Blindness ہے جس میں قابل تشریح Epistemic ہی ہے۔ یہ لفظ episteme یونان سے چلا آ رہا ہے اور ہے بھی یونانی۔ افلاطون نے بھی استعمال کیا ہے اور اس سے پہلے اور بعد کے فلاسفہ نے بھی مگر تب تک اس کے معانی زیادہ تر علم، سائنس اور سمجھنے کے تناظر میں تھے۔ اس کے برعکس مشل فوکو (Michel Foucault) نے اس کے معانی میں بہت وسعت پیدا کی اور لکھا:

In any given culture and at any given moment, there is always only one épistémè that defines the conditions of possibility of all knowledge, whether expressed in a theory or silently invested in a practice(3).

فوکو کے اس اقتباس کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ Episteme کسی بھی زمانے کے تمام علوم کی بصیرت و دانائی ہے۔ جس کے ہاتھ Episteme آگئی اس کے پاس تمام علوم کی کلید آگئی اور جو اس سے بے بہرہ رہا وہ گویا حکمت و بصیرت سے محروم کر دیا گیا یعنی Epistemic Blindness کا شکار ہو گیا۔ نعت اور حضور ﷺ کی ذات کے تناظر میں استعمال ہونے والی یہ دو اصطلاحیں ایک نعت گو اور عاشق کو بہت کچھ سکھاتی ہیں۔

اس کے بعد فاضل مصنف نے توحید اور توحید اسلام پر اس طور بحث کی ہے کہ حضور ﷺ کی ذات بابرکات کو توحید اسلام کی اساس قرار دیا ہے جس سے مسیحی نظریہ، بتائلیٹ اور یہود و نصاریٰ کی توحید میں افتراق جنم لیتا ہے۔ یہی وہ عظیم نکتہ ہے کہ جس سے توحید یعنی خدا کو ماننے کا تصور بھی دوسرے الہامی مذاہب سے مختلف ہوتا ہے اگر کوئی خدائی تصور اور الہ کی معنویت پر دوسرے مذاہب میں اشتراکات ڈھونڈے تو بنیادی طور پر وہ توحید اسلام اور درپردہ حضور ﷺ کی عظمت سے ناواقف ہے۔ اس کی دلیل کے لیے مصنف موصوف نے قبل از اسلام یعنی عربوں کے جاہلی دور میں بھی توحید کی مثالیں دی ہیں اور کہا ہے:

”لاریب توحید کے تصور کو قرآن میں مرکزیت حاصل ہے لیکن نشان خاطر رہے کہ توحید کا تصور حجاز کی سرزمین پر نیا نہیں تھا۔ حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی یہ تصور موجود تھا۔“ (4)

حضور ﷺ کی عظمت اور مقام پہ اجمالاً گفتگو کرنے کے بعد اقبال آفاقی نے نعت کے تخلیقی عمل پہ بات کی ہے۔ جس کے لیے وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ نعت کہنے میں دو ہی چیزیں سہارا اور توجیہ ہو سکتی ہیں یعنی یہ ان کا نعت کے بارے میں تنقیدی شعور ہے:

1. نعت رسول ﷺ بنیادی طور پر ایک روحانی تجربہ ہے جو حضوری (Presence) کے بغیر ناممکن

ہے۔

2. میرے نزدیک نعت (لکھنے) کا مقصد ایک قلبی واردات کو شعری سانچوں میں ڈھالنا ہے۔ (5)

مصنف نے یہاں عطا سے یا کمال ہو شیری سے اپنے لکھے پہ پہر ادا ہے اور قلبی واردات پہ گرفت بھی کی ہے۔ وہ تصوف اور ایسی ہی حالت میں کہی گئی باتوں اور حالتوں سے بھی بخوب واقف معلوم ہوتے ہیں کہ جب قلبی واردات کہا تو کوئی کچھ بھی کہہ کر بیچ

سکتا تھا کہ میں قلبی واردات کی تاثیر میں بہ گیا اور ہوش آنے سے پہلے اشعار سرزد ہو چکے تھے۔ جیسا کہ اکثر شعر اکا کہنا بھی ہے کہ ہم آمد میں اتنا بہ جاتے ہیں کہ آورد کا خیال نہیں آتا اور شعر اپنی تاثیر و لفظیات لے کے خود اترتا ہے۔ جس کے لیے پھر غالب کا سہارا لیتے ہیں کہ آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ بقول غالب صرف خیال ہی غیب سے وارد ہوتا ہے اسے شعر یا نثر پارہ بنانے کے لیے مزید مرصع سازی کرنا پڑتی ہے۔ بقول آتش: شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا۔ اس لیے فاضل مصنف نے قلبی واردات پہ بات کر کے اس قضیے کے گرد حصار کھینچ دیا، لکھتے ہیں:

”نعت جس قلبی واردات سے برآمد ہوتی ہے اس میں یقیناً وراثت کا ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں زمان و مکالمہ پسا ہو جاتے ہیں۔ بس وراثت ہی وراثت رہ جاتی ہے لیکن اس وراثت میں حالت سکر سے گریز اور شطیحات سے پرہیز کڑی شرط ہے۔ گویا نعت کا مافیہا نا قابل گرفت ہونا چاہیے۔ بلند آہنگی اور خود سری بھی یہاں ممنوع ہے۔“ (6)

اس ایک اقتباس میں بہت کچھ ہے یعنی وراثت، حالت سکر، شطیحات، نعت کا مافیہا، بلند آہنگی اور خود سری۔ ان سب کو ایجاز کے ساتھ دیکھنا لازم معلوم ہوتا ہے۔

وراثت ایک کیفیت ہے جس میں کوئی بھی انسان ایک خاص جلوے یا تاثیر کی بدولت اپنے ہوش سے الگ ہو کر ایک خاص مقام پر فائز ہو جاتا ہے اور وہاں وہ اپنا آپ بے خود کر دیتا ہے اور اس کے ہوش و ہوا اس جاتے رہتے ہیں۔ وہ کچھ بھی کہے یا کرے قابل گرفت نہیں رہتا کہ وہ اپنے ہوش (Senses) میں نہیں ہوتا۔ اس کے لغوی معنی: دور ہونے کی حالت یا کیفیت، الگ یا مختلف ہونے کی کیفیت: (تصوف) الگ ہونا بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ تصوف میں تو یہ ایک مرغوب موضوع ہے۔ فارسی شعر انے اس پر کھل کر لکھا ہے مگر یہاں اسی تناظر میں اردو کے سرخیل شعر کے اشعار دیکھیے:

دکھائی	دیئے	یوں	کہ	بے	خود	کیا
ہمیں	آپ	سے	بھی	جدا	کر	چلے (میر)
بے	خودی	بے	سبب	نہیں	غالب	
کچھ	تو ہے،	جس	کی	پردہ	داری	ہے (مرزا غالب)
کاروبار	جہاں	سنورتے	ہیں			
ہوش	جب	بے	خودی	سے	ملتا	ہے (گلبر)
ہوش	والوں	کو	خبر	کیا	بے	خودی
عشق	کیجے	پھر	سمجھئے	زندگی	کیا	چیز
بے	خودی	میں	لے	لیا	بوسہ	خطا
یہ	دل	پیتاب	کی	ساری	خطا	تھی
					میں	نہ
					تھا (میرزا ابوالمظفر ظفر)	

عالم سے بے خبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں
ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا (اصغر گونڈوی)
شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی (سراج اورنگ آبادی)

ایسا نہیں ہے کہ میں نے زیادہ اشعار لکھ دیے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے میں نے چند مختلف تناظرات پر مبنی ایک ہی خیال کے شعر درج کیے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ وراثت اور بے خودی نعت کے میدان میں کیوں منع ہے۔ اردو شعر اکے ہاں سینکڑوں ایسے اشعار اور بھی مل جائیں گے۔

حالتِ سکر؛ یہ ایک ایسی حالت ہے کہ جس میں انسان اپنے ہو اس کھو بیٹھتا ہے اور لامحالہ کچھ نہ کچھ کہ ڈالتا ہے۔ تصوف میں اسے زیادہ تر استعمال کیا اور بتایا جاتا ہے۔ اس کے لغوی معنی دیکھیے؛ نشہ، مستی، مدہوشی، بے خودی کی کیفیت، (تصوف) جب سالک جمال محبوب کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کی عقل عشق سے مغلوب ہو جاتی ہے، ادراک اور ہوش باقی نہیں رہتا ہے اور سالک پر سکر اور محویت اور فنا کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

شطحیات؛ یہ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ جن کا شریعت سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔ یہ حالتِ سکر یا وراثت کے تناظر میں کہی گئی باتیں ہوتی ہیں کہ جن کو ماننا عقل کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لغوی معنی دیکھیے؛ شطح کی جمع، خلاف شرع باتیں، فضول اور بے کار باتیں، مگر بات یہاں ہی ختم نہیں ہوتی اگر فاضل مصنف نے اس کی ممانعت نعت میں کی ہے تو اس کی وجہ ایک اور بھی ہے جس کو شیخ ابو نصر سراج نے اپنی کتاب ”کتاب اللمع فی التصوف“ میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور وہ اس کے دفاع میں بھی دلیلیں لاتے ہیں، مثلاً:

”صوفی جو بحالت وجد اپنے وجد کو اس قدر قوی پاتا ہے کہ وہ اپنے قلب پر وارد ہونے والے انوار حقائق کے غلبہ کا متحمل نہیں ہو سکتا تو یہ انوار اس کی زبان پر پھیل جاتے ہیں اور وہ ان کے بارے میں ایسی عجیب و غریب اور پیچیدہ گفتگو کرتا ہے کہ سننے والے کی سمجھ سے بالا ہوتا ہے۔ ہاں وہ لوگ اسے سمجھتے ہیں جو اس کا علم رکھتے ہیں۔ اس بنا پر ایسا کلام اہل اصلاح کے ہاں شطح کہلایا جانے لگا۔۔۔۔۔ اگر کوئی شخص ایسے صاحب مقام صوفیہ کے راستے پر چلا ہی نہ ہو تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ صوفیہ کے اس طرح کے کلمات سے انکار کو جانے دے اور انھیں اللہ پر چھوڑ دے۔ اس کے علاوہ اگر اس نے صوفیہ سے متعلق کوئی غلط ریمارکس دیئے ہوں تو ان کے غلط ہونے کا اعتراف کرے۔“ (7)

شطحیات کی ذیل میں تھوڑی تفسیر در آئی تو یہ اس اصطلاح کا تقاضا تھا تاکہ بات واضح ہو جائے۔

نعت کا مافیہا؛ مافیہا کا لغوی معنی ہی اس ترکیب کو واضح کر دے گا: یعنی جو کچھ اس دنیا میں ہے، جو کچھ زمین و آسمان میں ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ نعت کے ضمن میں مافیہا سے بہتر شاید ہی کوئی اور لفظ ہوتا کہ مصنف نے بتا دیا کہ نعت کا مافیہا ایسا ہونا

تنگنائے نعت کے آداب اور اقبال آفاقی

چاہیے کہ کوئی ایسا شخص جو کسی بھی طرح سے ظلمات دنیا میں گرفتار ہے تو وہ کسی بھی صورت نعت لکھنے کی جسارت نہ کرے اور اگر کرے تو خود کو اتنا پاکیزہ بنائے کہ ہر طرح کی آلودگی سے تذکیہ کر لے۔ وگرنہ نعت ایسی صنف سخن جو واردات قلبی اور روحانی تجربے کی بنیاد پر ہی ممکن ہو سکتی ہے ہر کس و ناکس کی طبع آزمائی کی بدولت سقم و جھول سے بچ نہ پائے گی۔ (جس کی کئی مثالیں ہم روزمرہ زندگی میں دیکھ بھی رہے ہیں۔)

بلند آہنگی؛ اس کا لغوی معنی؛ زور و شور، جوش و خروش، شور و غل ہے۔ اس کی بحث میں کیا جانا!! اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ نعت کا مافیہا کسی بھی قسم کے جذباتی پن کا متحمل نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں عشق کو بھی بے خودی کی بجائے باخود ہو کے چلنا پڑتا ہے اور خیال کے پرندے کو بیٹھا کر اڑتے دکھانا ہوتا ہے۔ سوچ، عقل، خیال، جذبات، محبت اور عشق میں ٹھہراؤ ہی سے یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ طبیعت میں جوش اور لالابالی پن حتیٰ کہ موزونی طبع کی روانی بھی بلند آہنگی کی طرف لے جا سکتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعر کہنے کا کمال بھی زوال کا باعث ہو سکتا ہے۔

خود سری؛ اس کا لغوی معنی اپنے آپ کو بہتر تصور کرنا، خود پسندی، غرور، خود رائی ہے۔ میر وغالب کے شعر دیکھیے:

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا (میر)
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی (غالب)

مگر یہاں پر بالعموم کے ساتھ بالخصوص بھی مراد ہے یعنی شعر کہنے کا کمال اور شعری نزاکتوں اور قرینوں پر مکمل دسترس۔ ایسی باتیں فنکار کی خوبی مانی جاتی ہیں مگر نعت میں ایسا کیوں ہے کہ اس سے منع کیا گیا ہے۔ مقالے کے مصنف نے اسی مقالے میں ایک اور جگہ اس کی تصریح کی ہے، لکھتے ہیں:

”نعت جمالیاتی مسرت و حظ کی خاطر ذہنی آوارہ گردی اور تخیل کے بے محابہ استعمال کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہاں کسی کو Poetic License کے دعویٰ کا یارا نہیں۔ جس کا دعویٰ نظم میں بالعموم اور غزلیہ شاعری میں بالخصوص شعر کرتے نظر آتے ہیں۔“ (8)

اس اقتباس سے اندازہ لگائیے کہ مصنف نے نعت کہنے کی خاطر صرف Poetic License اور شاعرانہ خوبیوں کو کافی نہیں سمجھا۔ جس کے بل بوتے پر نظم و غزل کے شاعر، شاعر کہلاتے ہیں۔

بلاشبہ نعت ایک تخلیقی عمل ہے اور مصنف موصوف بھی یہی کہتے ہیں؛ اس تناظر میں نعت کے اس تخلیقی عمل کو وہ دو پہلوؤں میں تقسیم کرتے ہیں:

1. شعری جمالیات کا پہلو

2. روح کی لطافت و ترفع کا پہلو

شعری جمالیات کا تعلق شعری لسانیات سے ہے اور روح کی لطافت و ترفع کا تعلق روحانی تجربات و واردات قلبی سے ہے یعنی جس قدر نعت گو حضوری کے درجے پر فائز ہو گا اس کی نعت میں لطافت و ترفع اسی قدر زیادہ ہو گا۔ اول الذکر پہلو کے لیے مصنف نے جو قاعدے پیش کیے ہیں وہ درج ذیل ہیں؛

1. Sublime کے وقوف سے بھرپور احساسِ مسرت و حظ

2. ذہنی آوارہ گردی و تخیل کے بے محابہ استعمال سے گریز

3. صرف Poetic License کا دعویٰ کافی نہیں

4. تلازمہ خیال کی متعینہ حد

ان سب میں سے Sublime پر ضرور بات ہونی چاہیے۔

Sublime جس کا ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ”علویت“ کیا ہے، کسی بھی فن پارے کی ایسی طرزِ ادا ہے جو (محدود معنوں میں) قاری کے اندر جوش، جذبہ، ترغیب اور احساسِ مسرت کو بھر دے۔ یہ لونجائنس (Cassius Longinus) کا نظریہٴ فن ہے جو اس نے اپنی کتاب On the Sublime میں پیش کیا تھا۔ اس کتاب کے چوالیس باب ہیں اور یہ ناقص الآخر ہے، اس کے درمیان سے بھی کئی صفحات ضائع ہو گئے تھے۔ اس میں ایک فن پارے کی علویت کے بارے میں اصول بیان کیے گئے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی حاشیائی یا عام سا نظریہ نہیں ہے۔ اس پر مفصل بات کرنے کے بجائے اس کی بنیادی خوبیوں پہ بات کر لیتے ہیں جسے لونجائنس نے خود ہی علویت کے ذرائع قرار دیا ہے:

1. عظیم تصورات کو تشکیل دینے کا ملکہ

2. طاقت ور اور الہامی جذبہ

3. صنائع معنوی اور صنائع لفظی کی موزوں ترتیب

4. اعلیٰ طرزِ ادا کی تخلیق

5. رفعت اور وقار سے پیدا کیا گیا مجموعی تاثر

علویت کے ذرائع کے علاوہ لونجائنس نے فن پارے کی علویت کے بارے میں کئی اہم نکات پہ بات کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ کون کون سی باتیں فن پارے کو علویت عطا کرتی ہیں اور کون کون سی باتیں فن پارے کی علویت کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ایک اور دلچسپ خوبی کا ذکر کرنا چاہوں گا جو کسی بھی فن پارے کو علویت عطا کرتی ہے؛ نعت سے تو بلا واسطہ اس خوبی کا تعلق بنتا ہے، شاید فاضل مصنف کے ذہن میں یہ خوبی بھی ہو گی جب انھوں نے Sublime ایسی خوبی کا نعت کے لیے ذکر کیا۔ وہ خوبی ہے: اخلاقی

تنگنائے نعت کے آداب اور اقبال آفاقی

عظمت (Moral Greatness): علویت پر مبنی تحریر کا تعلق اخلاقی بلندی سے بھی ہوتا ہے۔ یعنی مصنف کی ذاتی عظمت، دیانتداری اور اخلاقی خوبیاں اس کی تحریر کی عظمت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ نعت کا مافیہا میں وارداتِ قلبی اور روحانی تجربے کی ذیل میں یہ خوبی پہلے ہی مذکور ہو چکی۔

ثانی الذکر پہلو کے لیے کوئی خاص پیمانہ یا قاعدہ تو ترتیب نہیں دیا جاسکتا مگر فن پارے کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاعر کس حد تک روحانی تجربے سے گزرا ہے اور کس سطح کی وارداتِ قلبی رکھتا ہے۔ فاضل مصنف نے پھر بھی چار ایسے پہلو بیان کیے ہیں جو کلام میں روح کی لطافت اور ترفع کا باعث ہو سکتے ہیں:

1. ایسے کلام میں شاعر کی روح کا گداز پن ہو گا
 2. شاعر کی حضور ﷺ سے محبت کا اظہاریوں ہو گا کہ جو سامعین کو آپس میں متحرک رکھے گا
 3. ایسے کلام میں غلو اور ثولیدہ سری قطعی طور پر نہیں ہوگی
 4. ایسے کلام میں نبی اکرم ﷺ کے شخصی وقار اور ان کی سیرت و تعلیمات یعنی شریعت کی پابندی ہوگی
- مذکورہ بالا تمام اصول، قاعدے اور زاویے بنظر غائر دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ نعت کہنا واقعی میں ایک تنگنائے سے گزرنا ہے جس میں چاروں طرف سوائے غولِ بیابانی کے کچھ نہیں؛ جو نعت گو کو کبھی بھی بھٹکا کر گمراہ کر سکتے ہیں اور اسے احساس تک نہیں ہو گا۔

یہاں یہ بات بھی جان لینا چاہیے کہ ہمارے بہت سے نعت گو حضرات فقط اس لیے نعت کہتے ہیں کہ ”ثواب“ مل جائے گا جو کہ ایک انتہائی کمزور اور ناقص دلیل ہے۔ کیوں کہ اگر یہ واقعی مان لیا جائے کہ نعت روحانی تجربے اور وارداتِ قلبی کے بغیر ممکن نہیں تو ایک نعت گو شاعر کبھی بھی ثواب کا نہیں سوچے گا۔ وہ تو اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں اور محبوب کے بارے بات کرنے کے بہترین سلیقے ڈھونڈے گا۔

میں نے مقالے کے شروع میں تنگنائے غزل کی بابت معنوی حیثیت سے بات کی تھی کہ بہت سے لوگ اسے اصل طور پر نہیں سمجھے اور یوں سلسلہ نظم کے مختلف تجربات سے ہوتا ہوا انٹری نظم تک جا پہنچا۔ یہی حال تنگنائے نعت کی بابت بھی ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ ہم روز دیکھتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی ایسی نعت آجاتی ہے جو کسی پیر یا بزرگ کا قصیدہ، کسی گانے کی ہو بہو نقل، فرقہ وارانہ ترویجی مواد یا پھر سماجی و معاشرتی مسئلے پر بے تکی سی تکرار ہوتی ہے۔ اگر صنفِ نعت کو اس تنگنائے سے گزار کر تجزیہ و نقد نہ کیا گیا تو پھر نعت، نعت نہیں رہے گی کچھ اور ہی بن جائے گی۔ (خاکم بدہن)۔

حوالہ جات

1. اقبال آفاقی، ڈاکٹر، گنجینہ معنی کا طلسم (لاہور: مِثال پبلشرز، 2024ء)، 328۔
2. اقبال آفاقی، ڈاکٹر، گنجینہ معنی کا طلسم، 323۔
3. <https://en.wikipedia.org/wiki/Episteme> تاریخ: 5 اکتوبر، 2024ء، وقت: رات 01:52
4. اقبال آفاقی، ڈاکٹر، گنجینہ معنی کا طلسم، 325۔
5. ایضاً، 327۔
6. ایضاً
7. ابو نصر سراج، شیخ، کتاب اللع فی التصوف، مترجمہ اسرار بخاری، سید (لاہور: تصوف فاؤنڈیشن، 2000ء)، 625-26۔
8. اقبال آفاقی، ڈاکٹر، گنجینہ معنی کا طلسم، 327۔

References in Roman Script

1. Iqbal Afaqi, Doctor, Ganjeena-e-Ma'ni ka Tilsam (Lahore: Misaal Publishers, 2024), 328.
2. Iqbal Afaqi, Doctor, Ganjeena-e-Ma'ni ka Tilsam, 323.
3. <https://en.wikipedia.org/wiki/Episteme>, 5 October 2024, at 01:52 am.
4. Iqbal Afaqi, Doctor, Ganjeena-e-Ma'ni ka Tilsam, 325.
5. Ibid, 327.
6. Ibid.
7. Abu Nasr Siraj, Sheikh, Kitab al-Luma' fi al-Tasawwuf, Mutarjim: Syed Asrar Bukhari (Lahore: Tasawwuf Foundation, 2000), 625–26.
8. Iqbal Afaqi, Doctor, Ganjeena-e-Ma'ni ka Tilsam, 327.